بیسوی صدی عیسوی سے اُترپردیش میں عربی زبان و ادب

کا آغاز و ارتقاء

مقالہ نگار: پرویز احمد وگے

نگراں : ۔ پروفیسر عائشہ رائیس کمال

شعبہ :۔ عربی ، برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال (ایم ۔پی)

ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں عربوں کی آمد کا سلسلہ اسلام کے آغاز سے بہت پہلے شروع ہوچکا تھا لیکن چونکہ ان کی الگ کوئی بستی نہیں تھی اس لئے عربی زبان کا رواج بھی نہ ہوسکا ۔ البتہ کچھ مخصوص تجارتی الفاظ ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں ضرور داخل ہوگئے مگر مسلمانوں کی حکومت کے بعد اس ملک میں باقاعدہ عربی تعلیم کا رواج ہوا۔ اس قدیم دور کی نہ تو سیاسی و سماجی حالات پر کوئی تفصیل موجود ہے اور نہ ہی عربی علام و فنون کے متعلق کوئی اہم دستاویز دستیاب ہے ۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کا دوسرا دور محمود غزنوی کے حملوں سے شروع ہوتا ہے ۔ وسط ایشیاء ، ایران ، اور افغانستان کی راہ سے عربی زبان و ادب اور اسلامی علوم کا ایک نیا دھارا اس ملک میں داخل ہوا ۔ جیسے جیسے اس ملک میں مسلمانوں کی تعداد بڑھتی گئی عربی زبان و ادب اور اسلامی علوم کی اہمیت میں بھی اضافہ ہوتا گیا ۔

اترپردیش ، جو آزادی سے پہلے چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم تھا جن میں جونپور ،رامپور ، بنارس ، اودھ ،الہ آباد ، عظیم آباد ، لکھنؤ اور اعظم گڑھ ، وغیرہ قابل ذکر ریاستیں قائم تھیں ۔ یہاں عربی زبان و ادب اور عربی علوم و فنون کا آفتاب کب طلوع ہوا اس کا تعین کافی مشکل ہے ،غالباً محمود غزنوی کے ایک سپہ سالار جنرل مسعود غازی علوی (۴۰۵ ھ ۔ ۴۸۸ ھ) نے دہلی فتح کر نے کے بعد اودھ کو فتح کرتے ہوئے بنارس تک کا علاقہ فتح کیا اور اطراف و جوانب کی ہر بڑی بستی میں مہمات روانہ کیں۔ ۱

سپہ سالار مسعود غازی کی شہادت کے بعد شہاب الدین غوری نے اس علاقے کی باگ ڈور سنبھالی ۔۸۹۱ ھ میں شہاب الدین غوری نے قنوج پر فوج کشی کی اور راجہ جے چندر راٹھور سے اٹاوہ کے قریب جنگ ہوئی جس میں مسلمان فتحیاب ہوئے اور یہی سے عربی زبان و ادب کا پہلا دور شروع ہوتا ہے ۔اتر پردیش کا پہلا علمی دور سلطان قطب الدین ایبک کی سلطنت کے آغاز ۶۰۲ ھ سے شروع ہو کر تغلق دور میں ۷۷۲ واجد علی شاہ کو گرفتار کر کے قید کر دیا ۔ اور ۷ فروری ۱۲۷۳ ھ میں کرنل اوٹرم نے پورے اودھ پر قبضہ

کرکے ایسٹ انڈیا کمپنی کو دے دیا ۔ جب انگریزوں نے اس دیار مین قدم رکھا تو مسلمان یہاں ایک تعلیم یافتہ اور مہذب قوم تھی لیکن انگریز انھیں ان کے اس ورثے اور اثاثے سے محروم کرنا چاہتے تھے ۱۸۵۷ ءکے انقلاب کے بعد اس مقصد کے لئے انھوں نے کئی اقدام کئے ۔

مسلمانوں کا ایک زمانے سے اپنا ایک الگ تعلیمی نظام تھا ، ہر جگہ مدارس موجود تھے ان درسگاہوں میں نئی نسل کی تعلیم و تربیت کا کام جاری تھا مگر حکومت نے قوانین بازیافت نافذ کر کے اوقاف کے نظام کو ختم کر دیا ۔

انگریزوں کی آمد سے قبل ہر جگہ عربی و فارسی زبانوں کی باقاعدہ تعلیم ہوتی تھی ، مگر ۱۸۳۵ ء میں میکالے نے اپنی تعلیمی اسکیم نافذ کی اور عربی و فارسی کے نظام تعلیم کو ختم کردیا ۔ اس ضرب سے مسلمانوں کی نئی نسل کا رشتہ دین ، تہذیب اور ماضی سے کٹ کر رہ گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان اپنے اسلاف کے کارناموں اور اپنے مقام سے بے خبر ہوگئے ۔ فارسی زبان کی سرکاری حیثیت ختم ہوتے ہی اسلامی تہذیب کے اثرات بھی ختم ہونے لگے ۔

انگریزوں نے اس ملک میں انگریزی تعلیم اور انگریزی ثقافت کو جاری کیا ، ملک میں مسیحی طرز کے اسکول کھولے گئے جن میں عیسائیت کی تعلیم حاصل کرنا لازمی تھا ۔ اور نوکری کے درء ازے ان ہی کالج کے طلباء کے لئے کھلے ہوئے تھے ۔ مسلمانوں کی غربت نے یہ گوارہ نہ کیا کہ وہ روٹی کے چند ٹکڑوں کی خاطر اپنا دین اور اپنا ضمیر بیچ دیں ۔ اس لئے نظام تعلیم کے ڈھانچے کا مقصد مسلمانوں کو جدید تعلیم سے دور رکھتا تھا ۔ بقول مولانا سید ابو الا علیٰ مودودی ‘‘بعد میں جب انگریزی دور آیا تو اس نے ہمارے قوانین کو بدلا ، ہمارے معاشی نظام کو بدلا ، ہمارے معاشرتی نظام پر بدترین اثرات ڈالے ۔اسلامی تعلیم بالکل اسی بات پر منحصر ہوگئی کہ کھاتے پیتے لوگ مدد کریں تو اسلامی مدارس چل سکیں ۔ حکومت نے ان مدارس کے تعلیم یافتہ لوگوں پر روزی کے دروازے بند کردئیے ۔ اس کے برعکس جو نظام تعلیم انگریزوں نے رائج کیا وہ مسلمانوں نے ذہن سے خدا ، رسول اور آخرت کے تصورات بالکل مٹا دینے والا تھا ۔[۲]

انگریزوں نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ انھوں نے اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے اور اسلامی تہذیب کو داغدار بنانے کی خاطر تاریخی حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا شروع کیا ۔ یہ کام انگریز مستشرقین نے تحقیق کے نام پر کیا ۔ انھوں نے اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ اس طرح مرتب کی کہ مسلمان کے ذہن میں شکوک و شبہات جنم لینے لگے ۔ ان کی اس تحقیق نے ہندؤں کے دلوں مین مسلمانوں کے تئیں سخت نفرت کا جذبہ پیدا

کردیا ۔ اس طرح انگریز مستشرقین نے یہ شوبہ بھی چھوڑا کہ مسلمان تو اس ملک مین غیر ملکی ہیں اورصرف ہندو ہی اس ملک کے اصل باشندے ہیں ۔ اس بات کو اتنی شہرت دے دی کہ ہندوستان کا لفظ سنتے ہی ہندو کا تصور ذہن میں آتا ہے ۔ یہی وہ شوبہ ہے جس کے بعد سے ہندو مسلم فسادات کا آغاز ہوا ۔ بقول سرسید احمد خان ‘‘ کوئی آفت ایسی نہیں چلی جس کے پہونچنے سے قبل مسلمان کا گھر نہ ڈھونڈس ہو ۔ ان دنوں انگریزی اخبار جو میری نظر سے گذرے اور جو کتابیں اس ہنگامے کی بابت تصنیف ہوئیں وہ خود ہی میں نے دیکھیں ۔ ہر ایک مین یہی دیکھا کہ ہندوستان مین مفسد بدذات کوئی نہیں مگر مسلمان ، کوئی کانٹا اور درخت اس زمانے مین نہیں اُگا جس کے بارے میں یہ نہ کہا گیا کہ اس کا بیج مسلمانوں نے بویا تھا ۔ ۳

ایسے پر آشوب اور پر متن دور میں ‘ سرسید احمد خاں ’ مسلمانوں کے لئے مسیحا ثابت ہوئے ۱۸۵۷ ءکی بغاوت اور اس کے بعد پورے ہندوستان میں مسلمانوں کی تباہی و بربادی کے وہ عینی شاھد تھے ۔ ان کا اپنا گھر بار لٹ چکا تھا ، ان کی کئی اعزاہ و اقارب بغاوت کے شعلوں کے نذر ہوگئے تھے اور پورا ملک انتقام کے شعلوں میں جل رہا تھا ۔ شمالی ہند میں مسلمانوں کی تباہی ، زبوں حالی دیکھ کر وہ اس قدر مایوس ہوئے کہ انھوں نے ہندوستان چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ۔ ۴ لیکن پھر ان کے ضمیر نے آواز دی کہ یہ فرار اور بزدلی ، قوم اور ملت کے ساتھ بدخواہی اور خیانت ہوگی ۔ چناچہ انھوں نے ارادہ ترک کر دیا ۔

وہ ایک حقیقت پسند شخص تھے سلطنت مغلیہ کے زوال ۱۸۵۷ ءکی بغاوت اور مسلمانوں کی تباہی اورزبوں حالی سے بہت دکھی تھے اور وہ امت مسلمہ کی ہچکولے کھاتی ہوئی کشتی کو ساحل تک لگانے کے لئے کمر بستہ ہو گئے ۔ وہ دور اندیش اور حوصلہ مند شخص تھے وہ دیکھ رہے تھے کہ ملک میں انگریزوں کی حکومت کی جڑیں کافی مضبوط ہو چکی ہیں اور انگریزی سامراج سے قوت کے ذریعے مقابلہ نادانی اور خود کشی کے مترادف ہوگا ۔ سرسید کا خیال تھا کہ صرف تعلیمی ترقی ہی سے مسلمانوں کی تقدیر بدل سکتی ہے ۔ چناچہ انھوں نے اپنی مصالحانہ کوششوں میں تعلیم کو سب سے مقدم رکھا ۔ انھوں نے مرادآباد مین قیام کے دوران ایک اسکول کھولا ۔ جب غازی پور تبادلہ ہوا تو وہاں بھی ایک اسکول کھولا ، جہاں عربی ، فارسی اور انگریزی تعلیم کا بھی بندو بست تھا ۔ انھوں نے ایک سائنٹیفکیٹ سو سا ئیٹی قائم کی ۔ سرسید مذہبی تعلیم کے مخالف نہیں تھے لیکن قدیم طرز تعلیم اور مذہبی اصناب کو موجودہ زمانے کے لئے ناکافی سمجھتے تھے ۔ انھوں نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا کہ صرف عربی و فارسی اور قدیم شرعی علوم کے ذریعے قوم کو آگے نہیں بڑھایا جاسکتا ۔ بلکہ اس کے لئے جدید تعلیم کے

حصول کا شوق پیدا کرنا ضروری ہے ۔ اسی غرض کے لئے انھوں نے انگلینڈ کا سفر کیا اور ۱۸۷۰ ء میں انگلینڈ سے واپس آئے اور علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی اور مسلمانوں میں حصول علم کے لئے حوصلہ اور لگن پیدا کیا ۔ سرسید اپنی تمام مخالفتوں کے باوجود اپنے مقصد کے لئے سرگرم رہے جس میں انھیں کامیابی نصیب ہوئی ۔

۱۸۵۷ء کا انقلاب مسلمانوں کی آنکھ کھولنے کے لیے کافی تھا ان کی آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ چکا تھا ، اور ان کو اپنی حیثیت اور اپنی پوزیشن کا احساس ہوچکا تھا ۔ سرسید نے جہاں عربی زبان اور عربی علوم و فنون سے مسلمان کو روشناس کرانے کے لئے مدرستہ العلوم قائم کیا ، وہیں دوسری طرف کچھ علماء ایسے بھی تھے جنھوں نے قوم کے دینی و علمی ورثہ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی ۔ دارالعلوم دیوبند ، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ وغیرہ اسی مقصد کے لئے قائم کیے گئے تھے ۔

انیسویں صدی میں سامراجیت نے دنیا کے مختلف کمزور ملکوں کو اپنے تصرف میں لے لیا تھا انسامراجی حکمرانوں کا سب سے پہلا کام محکوم قوم کو جہالت و غربت میں مبتلا کرنا تھا ۔ یوروپی سامراجیت نے محکوم ملک کے مادی و قدرتی وسائل پر قبضہ کیا ، وہاں کے مدارس اور اسکولوں کو بند کیا اور وہاں کے باشندوں کو محتاج بنا دیا ۔ انھوں نے اپنی تہذیب اور اپنی زبان کو عام کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ۔ مگر مسلمانوں نے ان کے تہذیب کو آسانی سے قبول نہیں کیا بلکہ اپنے تشخص اور اپنی انفرادیت کو باقی رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی اس لئے وہ ان سامراجی طاقتوں کا نشانہ دیگر قوموں کی بنسبت زیادہ بنے ۔۵

انگریزوں نے بھی مسلمانوں کو روز اول ہی سے اپنا دشمن تصورکیا ۔ انھوں نے اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا کہ جب تک مسلمانوں کا رشتہ مذہب اور علم کے منقطع نہ کر دیا جائے ۔ انھیں علمی میدان سے بے دخل نہیں کیا جاسکتا ۔ ہندوستانی حکومت پر انگریزوں کے قبصے سے قبل ، ملک کے طول ، عرض میں ہزاروں مدارس چل رہے تھے ان مدارس کے اخراجات حکومت کے تعاون اور اوقاف کی امداد سے پورے ہوتے تھے ۔ ان مدارس میں شرقی علوم کے ساتھ ساتھ عربی اورفارسی کی بھی تعلیم ہوتی تھی ۔ انگریزوں نے سب سے پہلے ان مدارس کو تعاون دینا بند کردیا اور اوقاف کے نظام کو کالعدم قرار دیا ۔ رفتہ رفتہ یہ مدارس جو مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کے محافظ اور عربی زبان و ادب کی ترقی کے ضامن تھے ۔یکایک زمین بوس ہوگئے اس طرح عربی زبان و ادب کا علم حاصل کرنا خاصا مشکل ہوگیا ۔ لیکن سرسید کی علمی تحریک اور محمد قاسم نانوتوی کی مذہبی تحریک نے ایک بار پھر مسلمانوں کے اندر مشرقی علوم کے حصول کے ساتھ ساتھ

سائنسی علوم کے حاصل کرنے کا حوصلہ پیدا کیا ۔ اور آج ان بزرگوں کی کوششوں کا ہی نتیجہ ہے کہ مسلمانوں نے نہ صرف اپنے مذہبی ورثے کی حفاظت کی بلکہ سائنسی علوم میں بھی مہارت پیدا کی ۔ہ۶ ہندوستان میں خاص کر اتر پردیش میں ایسے عربی ادیب پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی صلاحیت و استعداد کا نہ صرف ہندوستان میں لوہا منوایا بلکہ عرب دنیا نے بھی ان کی تحقیقی کاموں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنی کتاب ''ہندوستانی مسلمان '' میں ان مصنفین کا تذکرہ کیا جن کی شہرت ہندوستان کی حدود سے متجاوز ہو کر دوسرے ممالک میں پہنچ چکی ہے بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے چناچہ اس صدی کے عربی مصنفین کے بارے مین لکھتے ہیں:

''ہندوستان نے اس صدی میں بھی بکثرت ایسے مصنفین پیدا کئے جو زود نویسی اور کثرت تصانیف میں پورے عالم اسلام سے بازی لے گئے۔ ان میں ہر شخص کی حیثیت ایک مستقل اکیڈمی اور سر گرم عمل انجمن کی تھی چناچہ نواب صدیق حسیں خاں والئی بھوپالی کی تصانیف کی تعداد دو سو بائیس (۲۲۲) ہیں جن میں ۵۶۔(چھپن) کتابیں عربی زبان مین ہیں ان میں '' فتح البیان فی تفسیرالقران ، (دس جلد) ابجد العلوم ، التاج المکلکل ، البلغۃ فی اصول اللغۃ ، العلم الخفاق من علم الاشتقاق، '' وغیرہ قابل ذکر ہیں ۔

مولانا عبد الحئی فرنگی محلی کی تقریباً چھیاسی (۸۶) کتابیں عربی زبان و ادب میں ہیں جن میں ''السابعۃ فی شرح الوقایۃ ، مصباح الدجی ، التملیق المسجد ، ظفر الامانیاور علماء احناف کے تذکرہ میں ان کی کتاب '' الفوائد البھیمۃ ''سب سے مقبول کتاب ہے ۔ اسی طرح حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی ؒکی سیکڑوں تصانیف میں نسے ۱۳ کتابیں عربی میں ہیں ''۔ ۷ہ

تذکرہ و تراجم پر مشتمل ایک طظیم الشان تصنیف '' معجم المصنفین '' ہے جس کے مصنف مولانا محمود حسن خان ٹونگی ہیں یہ تقریباً بیس ہزار صفحات پر مشتمل ہے جس میں چالیس ہزار مصنفین کے حالات جمع کئے گئے ، اس کتاب کی وسعت و ہمہ گیری کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ مؤلف نے تقریباً دو ہزار مؤلف نے عربی زبان و ادب میں جدید الفاظ کی نئی تعبیرات تلاش کرنے اور آج کل کی صحافت میں مستعمل الفاظ کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے لیکن آپ کی یہ کوشش بہت ہی محدود ہے ۔

عربی زبان و ادب میں شعر و سخن کے میدان میں بھی علماء ہند کسی سے پیچھے نہیں رہے ہیں ۔ اس میدان میں ایسے مصنفین کے حالات جمع کئے ہیں جن کا نام '' احمد '' ہے اس کتاب کے چار حصے بیروت سے چھپ چکے ہیں ۔

فن حدیث کی خدمات میں علماء ہند کا انہماک و شغف مشہور ہے خصوصاً اس فن کی تعمیم میں تو انہیں سب پر فوقیت حاصل ہے بلکہ زمانہ ما بعد میں تو اس کی قیادت و امامت انہیں کے حصہ میں آئی بقول علامہ رشید رضاء مصری:

''اگر ہندوستانی علماء اس زمانہ میں علم و حدیث کی طرف توجہ نہ کرتے تو یہ فن مشرقی دنیا سے

رخصت ہوجاتا کیونکہ مصر شام ، عراق و حجاز میں دسویں صدی ھجری سے علم حدیث زوال پزیر ہوگیا

تھا '' ۸ے

ہندوستان میں اس فن کو عام کرنے میں جہاں ہزاروں مدارس کا بہت بڑا ہاتھ ہے وہیں پر ان بے شمار علماء کا بہت بڑا احسان ہے جنہوں نے اس فن پر کتابیں اور شروحات لکھی ہیں ۔ عربی لغت اور فلسفہ زبان کے موضوع پر کسی عجمی النسل ہندوستانی کا قلم اٹھانا اس کے باکمال اور باذوق ہونے کی دلیل ہے چناچہ علماء ہند کی بے شمار اسی موضوع پر پائی جاتی ہے ۔ دور حاضر میں بھی ہندوستانی علماء نے عربی زبان و ادب کی خدمت میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا چناچہ متعدد قوامیس و معاجم اور ڈکشنریاں ہیں جو دورِ حاضر میں علماء ہند کے درخشاں کارنامے ہیں ۔ مولانا عبد الحفیظ بلیادی جو دارالعلوم کے ہونہار فاضل تھے ، ان کی عربی اردو ڈکشنری ''مصباح اللغات'' ان کے ادبی ذوق کی واضح دلیل ہے اگرچہ یہ کتاب '' المنجد '' کا ہی ترجمہ ہے لیکن یہ لغت علماء و طلباء کے نزدیک آج بھی بے حد مقبول ہے ۔ے۹

اسی طرح قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی فاضل دارالعلوم دیوبند نے قرآنی لغت پر کام کیا ہے اور انھوں نے قاموس القرآن کے نام سے ایک لغت مرتب کی ، جس میں تمام الفاظ قرآنی کا صحیح اردو ، ترجمہ اور ان کی مکمل صرفی و نحوی تشریح کے علاوہ جملہ وضاحت طلب الفاظ پر سہل و شیریں زبان میں مختصر مگر جامع اور مستند نوٹ لکھے گئے ہیں ، اسی موضوع پر سب سے زیادہ کامیاب اور مشہور لغت '' لغات القرآن '' شائع کردہ ندوۃ المصنفین دہلی ہے ۔

اسی طرح قاضی زین العابدین صاحب کی جدید عربی لغات کی سمت ایک کوشش '' بیان اللسان '' ہے ،انھوں نے حیرت انگیز کامیابی حاصل کی چناچہ ہندوستان میں خاص کر اترپردیش میں بے شمار خوشگو ، پرگو ، مغز بیان شعراء پیدا ہوئے ، مثلاً مولانا غلام علی آزاد بلگرامی صاحب '' سبع سیارۃ '' ، مولانا فیض الحسن سہارنپوری ، علامہ انور شاہ

کشمیری ، مولانا ذوالغفار علی دیوبندی ، مولانا حبیب الرحمان عثمانی اور اس دور کے مشہور قصیدہ گو شاعر مولانا عبدالمنان دہلوی قابل ذکر ہیں ۔ ۱۰ ؎

علاوہ ازیں اس صدی میں ایسے ایسے عربی ادباء پیدا ہوئے جن کی عربی دانی ، اسلوب نگارش ، عربی لغات اور نحو و صرف پر گہری نظر و علمیت کا لوہا عربوں نے بھی مانا ہے ۔ اور ان کی خدمات کا اعتراف کیا ہے ، جن میں سے پروفسر عبد العزیز میمن صاحب ، مولانا محمد سورتی ، مولانا ابوالحسن علی ندوی ، مولانا وحید الزماں کیرانوی وغیرہ قابل ذکر ہیں ، پروفسر عبد العزیز میمن صاحب کی عظمت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اہل عرب نے مفصل و مستند عربی لغت '' لسان العرب '' کی تصحیح کی کمیٹی میں آپ کو شریک کرکے آپ کے علمی استناد و امتیاز کا اعتراف کیا ہے ۔

اسی طرح مولانا ابوالحسن علی الندوی جن کے علم کی ضیاء پاشیاں دائرہ ہند سے نکل کر بلاد عربیہ تک روشنی کر چکی ہے ، ہندوستان کے وہ پہلے شخص تھے جنہیں '' رابطہ عالمِ اسلامی کا صدر ہو نے کا فخر حاصل رہا ہے ۔ آپ کی تصانیف اہل عرب میں بہت ہی مقبول ہیں ان چند مایہ ناز کتابوں میں '' ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین ، رجال الفکر و الدعوۃ ، الارکان الاربعۃ ، الصراع بین الحصارۃ الاسلامیہ و الغربیۃ فی الاقطار الاسلامیۃ '' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں ۔

نیز مولانا وحید الزماں صاحب بھی ہندوستان کے ادیبوں میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں ، آپ کی تحریروں کو بھی اہل عرب نے بہت سراہا ہے خاص طور سے وہ تحریریں جو '' دعوۃ الحق اور الکفاح '' میں شائع ہوئی ، عربی زبان و ادب سے متعلق آپ کی دو مشہور کتابیں ہیں '' القراۃ الواضحہ''تین حصئے نفحۃ الادب'' جو مختلف مدارسِ عربیہ و عصری جامعات کے درس میں داخلِ نصاب ہیں ، ہندوستانی عربی ادیبوں میں مولانا کو جس چیز میں امتیاز حاصل ہے وہ انکا عملی اسلوب ہے ۔؎۱۱

عربی صحافت کے میدان میں بھی اترپردیش(یو پی) نے غیر معمولی ترقی کی ہے ، عربی ہندوستانیوں کی عامیہ زبان نہ ہونے کے باوجود بھی بہت سے عربی رسائل و اخبارات یہاں سے شائع ہوتے ہیں ، اگرچہ ان میں کوئی بھی روزنامہ نہیں ہے لیکن پندرہ روزہ ، ماہنامہ ،اور سہ ماہی رسائل و اخبارات کی تعداد معتد بہ ہے کچھ اخبارات و رسائل قلتِ و مسائل اور بعض مجبوریوں کی وجہ سے اپنا تسلسل قائم نہ رکھ سکے لیکن جتنے رسائل و اخبارات آج شائع ہورہے ہین انکے قارئین کی تعداد کافی ہے اور دن بدن اس میں اضافہ ہورہا ہے ۔

موجودہ شائع ہونے والے اخبارات و رسائل میں چند مشہور ہیں ''الرائد '' ہندرہ روزہ ''البعث الاسلامی '' ماہنامہ یہ دونوں دعوت و اصلاح کے ترجمان اور اسلامی افکار و تصورات کے داعی کی حیثیت سے ندوہ سے پابندی کے ساتھ شائع ہوتے رہتے ہیں ۔ یہ دونوں عالم عربی میں ایک اہمیت کے حامل ہیں ''الداعی '' جو دارالعلوم دیوبند سے نکلتا ہے اور دارالعلوم کے نظریہ کا ترجمان اور ہندوستان و بیرون ہند کے مسلمانوں کے مسائل کو اپنے قارئین تک پہنچاتا ہے اکثرو بیشتر سیاسی اور سماجی احوال پر بھی سیر حاصل تحریر شائع کرتا رہتا ہے ۔ اور عربی انشاء کا اچھا معیار پیش کرتا ہے اس کے بانی مولانا وحید الزماں کیرانوی ہیں ، اور موجودہ ایڈیٹر مولانا نور عالم خلیل الامینی ہیں اسی طرح حیدر آباد سے سہ ماہی رسالہ '' الصحوة الاسلامیہ ، الجامعۃ السلفیہ '' بنارس اور '' صوت الامتہ ، ثقافتہ الہند '' دہلی بھی ایک خاص اہمیت کے حامل ہیں ۔ ان کے علاوہ وہ رسائل و اخبارات جو بعض مجبوریوں کی وجہ سے شائع ہونے بند ہوگئے لیکن عربی زبان و ادب کے فروغ میں ان کا قابل قدر حصہ ہے اور ان کی تحریر و مضامین آج بھی تحقیق وتالیف میں بڑی رہنمائی کرتی ہے ، ان میں '' البیان '' لکھنؤ سے نکلتا تھا جس کی مجلسِ مشاورت میں مولانا عمادی اور مولانا عبد الرزاق ملیحآبادی وغیرہ تھے ، '' الجامعہ '' ہفت روزہ ، مولانا ابوالکلام آزاد کی ادارت میں کلکتہ سے نکلتا تھا ، '' الضیاء '' ماہنامہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کا ترجمان تھا اس کے ایڈیٹر مولانا مسعود عالم ندوی تھے ۔ دارالعلوم دیوبند سے مولانا وحید الزماں صاحب کی ایڈیٹر میں سہ ماہی مجلہ '' دعوة الحق '' اور جمیعتہ العلماء ہند دہلی کے شعبہ نشرو اشاعت سے جمعیتہ کا ترجمان اور مسلمانوں کے مسائل کا علمبردار '' الکفاح '' پندرہ روزہ اخبار نکلتا تھا ۔ یہ تمام رسائل و جرائد اپنے اسلوب ، طرزِ فکر صاف کوئی اور بعض خصوصیات کی بنا پر آج بھی عربی سے تعلق رکھنے والے لوگوں میں کافی مشہور ہیں ، ان رسائل و اخبارات کی کاوشوں کی وجہ سے ہندوستان میں عربی زبان و ادب کو کوئی فروغ حاصل ہوا ۔ ۱۲ـ

اس کے بعد اترپردیش کا ایک مشہور شہر '' رامپور '' شہر ہیں ، جس میں عربی زبان و ادب سے متعلق جو اہم کام ہوا اس کی ایک لمبی فہرست موجود ہے ۔ نواب رامپور خود علم دوست اور علم پرور تھا ،یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے دربار بڑے بڑے سرخیل علماء ج،و فقہاء کو مدعو کرتا اور ان سے عربی علوم و فنون میں استفادہ کے ساتھ ساتھ مختلف موضوعات پر کتابیں بھی تحریر کراتا ، اس کے دربار سے وابستہ علماء میں امام المنطق ، علامہ فضل الحق خیر آبادی ، عبد الحق خیر آبادی ، عبد العلی رامپوری اور ارشاد حسین رامپوری سر فہرست ہیں ،اس شہر کے حالات پر سیکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں جن میں یہاں کے علماء اور مصنفین کے حالات تفصیل سے دیے گئے ہیں ۔ ریاست رامپور کے

علماء کے حالات میں سب سے اہم تذکرہ حافظ احمد علی خاں شوق ؔنے '' تذکرہ کاملان رامپور کے نام سے سپرد قلم کیا ہے ، یہ تذکرہ مختلف بار متعدد مطابع سے شائع ہوچکا ہے ، شوق رامپوری نے اس میں مفصل تحقیقی اور جامع علماء اور مصنفین کے تذکرے قلمبند کئے ہیں ، بھرحال ہورے اترپردیش میں عربی زبان و ادب کی ترویج و ارتقاء کے سلسلہ میں زبردست کام ہوا ۔

اس ضمن میں اترپردیش(یو پی) کے ادباء ، علماء ، مفسرین اور فقہاء و محدثین نے مشرقی علوم کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ عربی زبان و ادب کی نسب الغرض عربی زبان و ادب کا اترپردیش(یو پی) سے گہرا تعلق رہا ۔ اس زبان نے یہاں کے بہت سے خاکوں میں رنگ کاری کی ہے اور زندگی کی کئی اہم گوشوں کی طرف رہنمائی کی ہے ، اس کے رسم الخط کی دلکشی نے تو یہاں کے باشندوں کے دلوں پر اس طرح حکمرانی کی ہے کہ آج بیسویں صدی میں بھی بعض علاقوں کو اسی عربی رسم الخط پر اصرار ہے ۔

اترپردیش کے(یو پی) ادباء کا بیان یقینا ایک نکتۂ بحث ہے ۔ اس میدان میں وہ ضرور اہل زبان عربوں سے کچھ پیچھے ہیں لیکن یہ سقم بھی ، مسائل اور حالات کے تحت پیدا ہوا ، کسی لسانی کمزوری کی وجہ سے نہیں ، اصل میں سرزمین اترپردیش عربی زبان و ادب کے جن مضامین کا مطالبہ کرتی ہے مثلاً فقہ ، اصول فقہ ، منطق ، کلام ، فلسفہ اور مناظرہ وغیرہ تو اس میں خشکی م پھیکا پن نا ہمواریت اور تعقید کا پایا جانا ایک فطری بات تھی ، لیکن بعض دوسرے موضوعات جیسے تفسیر ، حدیث ، لغت ، تجوید ، وغیرہ فنون جنہیں اہل ہند نے خود حجاز جاکر ان کے سر چشمہ صافی سے حاصل کیا تھا ۔ ان میں انہوں نے طباعی ، جدت ادا اور ندرت بیان کا ثبوت دیا ہے ۔ے۱۳

سے زیادہ خدمت کی ۔ مغل سلطنت سے لے کر موجودہ زمانے تک اترپردیش (یو پی)میں ایسے ادباء موجود رہے ہیں، جنھوں نے عربی زبان و ادب کے میدان میں اپنی علمی و تحقیقی صلاحیتوں کا زندہ ثبوت دیا ہے اور آج بھی عربی زبان و ادب پر جتنا کام (یوپی)میں ہورہا ہے ، شاید ہی ہندوستان کے کسی گوشے میں عربی زبان و ادب کے مطالعے پر اتنی دلچسپی دکھائی جا رہی ہو ۔ مختلف یونیورسٹیوں مثلاًلکھنؤ ، الہ آباد ،بنارس و علی گڑھ مسلم ینورسٹی میں عربی کے شعبے موجود ہیں ، جہاں عربی زبان و ادب پر تحقیق کا کام بڑے ٹھوس انداز میں ہورہا ہے ۔طلباء و اساتذہ دونوں ہی بڑی دلچسپی کے ساتھ عربی زبان و ادب کے مطالعہ اور اس کی تحقیق و جستجو میں مصروف ہیں ۔ اس کے علاوہ عربی جامعات مثلاً مدرستہ الاصلاح ، مظاہر العلوم سہارنپور ، جامعتہ الفلاح ، دارالعلوم دیوبند ، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ، جامعہ سلفیہ بنارس وغیرہ میں بھی مذہبی ورثے کی حفاظت

کے ساتھ ساتھ عربی زبان و ادب پر بھی خاص توجہ دی جاتی ہے اور ان مدارس میں ایسے اساتذہ موجود ہیں جن کی صلاحیتوں کے اہلِ عرب بھی معترف ہیں اور ان کی متعدد کتابیں بھی عرب علماء سے دادِ تحسین حاصل کرچکی ہیں ۔

والہ جات

۱۔ دریاء یورپ میں علم اور علماء: ص ، ۲۲

۲۔ تحریک آزادی ہند اور مسلمان: ص، ۳۹

۳۔ اسباب بغاوت ہند : ص، ۱۴ ۴۔ ایضا: ص، ۵۱

۵۔ اسباب بغاوت ہند، مقدمہ فوق کریمی : ص ، ۶۵

۶۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ ، لاہور ، سید عبداللہ : ج ، ۲ ، ص ، ۱۲۱

۷۔ ہندوستانی مسلمان ، (ایک تاریخی جائزہ) سید ابوالحسن علی ندوی : ص ، ۴۳

۸۔ مقدمہ مفتاح کنوز السنتہ علامہ رشید رضا مصری ، مترجم محمد فؤاد عبدالبانی مصر : ۱۹۳۴

۹۔ ما ہنامہ دارالعلوم دیوبند ، (عربی زبان و ادب اور ہندوستان ۔ مولوی ابوالعاص وحیدی) ، ج ۴۷ ، ص ، ۱۸

۱۰۔ ثقافتہ الہند ، پروفیسر زبیر احمد فاروقی ، ج ، ۳۸ ، شمارہ ، ۱۔۴، ۱۹۸۷ ص، ۶۲

۱۱۔ ماہنامہ دارالعلوم دیوبند ، ج ۴۷، شمارہ ۴ جولائی ۱۹۴۷ ص، ۴۱۔۴۳

۱۲۔ ہندوستانی مسلمان ، (ایک تاریخی جائزہ) مولانا ابوالحسن علی الندوی : ص ، ۴۸۔۵۰

۱۳۔ ہندوستان میں عربی زبان و ادب کا فروغ : پروفیسر شبیر احمد ندوی ، ج ، اول ، مارچ ،۲۰۱۲ ؁ء ص ، ۲۲۲۔۲۲۴